باب سوم

خاتونِ مغرب

مغربی تہذیب کے بنیادی مراکز کا خصوصی مطالعہ

جدید مغربی تہذیب کا مولد اور اولین پیشوا انگلستان یا برطانیہ ہے۔ امریکہ سپر پاور ہونے کے باوجود مغرب کی تہذیبی اقدار کی نمائندگی کے حوالے سے آج بھی برطانیہ کا ہم پلہ نہیں۔ اس لیے مغرب میں عورتوں کے ساتھ برتاؤ کے حوالے سے برطانیہ کا خصوصی مطالعہ نہایت اہم ہے۔ مساوات مرد وزن کا نعرہ برطانیہ ہی میں سب سے پہلے بلند ہوا لیکن آزادیِ نسواں کی تحریک کو تقریباً تین صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی خود برطانوی اہلِ فکر ونظر کے مطابق برطانیہ کی عورت مساوی حقوق اور باوقار مقام سے محروم ہے اور دفاتر اور کارگاہوں میں اس کے ساتھ امتیازی سلوک معمول کا حصہ ہے۔ اس حوالے سے کچھ اہم حقائق اور معلومات اس باب میں پیش کی جارہی ہیں۔

تیس ہزار برطانوی عورتیں حمل کے باعث ہر سال روزگار سے محروم

مؤقر اور معروف برطانوی جریدے گارجین کی پانچ جون ۲۰۰۹ء کی ایک رپورٹ کے مطابق مساوات مرد وزن کی تحریک کے سرخیل اس ملک میں آج بھی ہر سال اوسطاً ۳۰،۰۰۰ عورتیں ملازمتوں سے فارغ کی جاتی ہیں۔ "Employers targeting pregnant women for redundancy" یعنی ''مالکان حاملہ عورتوں کو فاضل قرار دے کر نشانہ بنا رہے ہیں'' کی سرخی کے تحت شائع کی جانے والی اس رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''اپنی ملازمتوں سے محروم ہونے والی حاملہ عورتوں اور نئی ماؤں کی تعداد میں چونکا دینے والا اضافہ دیکھا جارہا ہے کیونکہ مالکان، بچے نہ رکھنے والے اُن کے دفتری ساتھیوں کے مقابلے میں انہیں غیر ضروری قرار دے کر ملازمتوں سے نکال دیتے ہیں۔ یہ معلومات اس ہفتے وجود میں آنے

والا مددگار گروپوں کا ایک اتحاد منظر عام پر لایا ہے۔ حاملہ عورتوں کے ساتھ کارگاہوں میں امتیازی سلوک کے خلاف بننے والے اتحاد The Alliance Against Pregnancy Discrimination In the Workplace نے وکلاء اور امدادی اداروں سے مشاورت کرنے والی عورتوں کی تعداد میں تیز رفتار اضافہ دیکھا ہے کیونکہ زچگی کی چھٹیوں یا ایام حمل کے دوران ان کی نوکریاں ختم کی جاتی رہی ہیں۔ اتحاد نے گزشتہ روز متنبہ کیا کہ: 'اس صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ بعض مالکان سرد بازاری کو امتیازی سلوک کے انسدادی قانون کو توڑنے کا بہانہ بنا رہے ہیں... زچگی کی چھٹی کے نتیجے میں ملازمت سے محرومی کے طویل المیعاد اثرات عورتوں کے مالی تحفظ کو ان کی پوری زندگی کے لیے خطرے میں ڈال دیتے ہیں۔

ایکولٹی (Equality) نامی تنظیم اور انسانی حقوق کے کمیشن کے مطابق اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال تقریباً تیس ہزار عورتیں حمل کی بناء پر اپنے روزگار سے محروم ہو جاتی ہیں، لیکن خدشہ ہے کہ معاشی انحطاط کی وجہ سے یہ تعداد اور بڑھے گی۔ حکومت اس نوعیت کے امتیازی سلوک کے بارے میں کوئی معلومات اور اعداد وشمار جمع نہیں کر رہی ہے اور ٹریبونلز سروس کے لیے اس عمل میں کوئی رکاوٹ ڈالنا فی الوقت محال ہے۔''[۱]

مردوں کے مساوی تنخواہ کے لیے ۹۸ سال مزید انتظار

گارجین نے اپنی ۳۱ اگست ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں ایک خبر اس سرخی کے ساتھ شائع کی ہے کہ ''خواتین ایگزیکٹوز کو مساوی تنخواہوں کے لیے ۹۸ سال انتظار کرنا پڑ سکتا ہے''

"Women executives could wait 98 years for equal pay, says report" یہ خبر برطانیہ کے چارٹرڈ مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ کی ایک رپورٹ پر مبنی ہے۔ اس کی ذیلی سرخی یہ ہے کہ ''انتظامی عہدوں پر کام کرنے والی عورتیں پہلے ہی مردوں سے دس ہزار پونڈ کم تنخواہ لے رہی ہیں''۔ خبر کا آغاز یوں ہوتا ہے: ''عورتوں کو رائے دہی کا مساوی حق ۱۹۲۸ء سے حاصل ہے مگر تنخواہوں میں برابری کے لیے انہیں مزید ۹۸ سال انتظار کرنا پڑ سکتا ہے۔ یہ بات ایک ریسرچ

کے نتیجے میں سامنے آئی ہے۔''

خبر میں مزید کہا گیا ہے کہ ''خواتین ایگزیکٹوز کی تنخواہیں اگرچہ اپنے مرد ساتھیوں کی نسبت زیادہ تیزی سے بڑھ رہی ہیں لیکن اگر اضافے کی رفتار وہی رہی جو اب ہے تو باہمی فرق ختم ہوتے ہوتے سن ۲۱۰۹ء آجائے گا، یہ انکشاف چارٹرڈ مینجمنٹ انسٹی ٹیوٹ نے کیا ہے۔ ریسرچ کی رو سے مرد منتظمین کو یکساں ذمہ داریوں کے لیے بدستور عورتوں سے زیادہ معاوضہ دیا جارہا ہے، عورتوں کی ۳۱۸۹۵ پاؤنڈ تنخواہ کے مقابلے میں مردوں کو اوسطاً ۴۲۴۴۱ پاؤنڈ دیے جارہے ہیں۔ ریسرچ کے مطابق پچھلے سال تنخواہوں میں جو فرق ۱۰,۰۳۱ پاؤنڈ تھا وہ بڑھ کر ۱۰,۵۴۶ پاؤنڈ ہوگیا ہے، باوجود یہ کہ فروری ۲۰۱۱ء تک بارہ مہینوں میں عورتوں کی تنخواہیں مردوں کی ۲ء۱ شرح کے مقابلے میں ۲ء۴ کی شرح سے بڑھیں۔''[۲]

بیس فی صد بڑی کمپنیوں کی انتظامیہ میں عورتوں کا حصہ صفر

گارجین کی ۱۳ اکتوبر ۲۰۱۱ء کی ایک خبر کے مطابق برطانیہ کی بڑی کمپنیوں کے ڈائرکٹروں میں عورتوں کا حصہ ہولناک حد تک کم ہے۔

'Shocking' lack of women top company directors, says report کی سرخی کے تحت شائع ہونے والی اس خبر میں، جس کی بنیاد ڈیلائٹ نامی ادارے کی ایک ریسرچ ہے، کہا گیا ہے:

''برطانیہ کی سب سے بڑی کمپنیوں کے بورڈ آف ڈائرکٹرز میں عورتوں کا ہولناک حد تک کم تناسب جمعرات کو منظر عام پر آنے والے ایک تجزیے سے عیاں ہوا جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ بھرتیوں کی موجودہ شرح سے بورڈ رومز میں یہ فرق بیس سال میں تین ڈائرکٹروں میں سے ایک کے عورت ہونے تک پہنچے گا۔ ڈیلائٹ کی اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ FTSE 100 کی ۲۰ فی صد کمپنیوں کے بورڈوں میں کوئی خاتون ڈائرکٹر شامل نہیں ہے جبکہ اعلیٰ انتظامی عہدوں میں سے صرف پانچ فی صد پر عورتیں فائز ہیں۔ ڈیلائٹ کی ٹیم میں شامل کیرول ایرواسمتھ کے بقول ایسی کمپنیوں کی تعداد بلاشبہ ہولناک ہے جن کے بورڈز میں کوئی خاتون رکن نہیں۔ یہ بات خاص طور

پر باعث تشویش ہے کہ دس سال کے دوران بورڈز آف ڈائرکٹرز میں عورتوں کا تناسب ۵ سے بڑھ کر صرف ۹ فی صد تک پہنچا ہے۔ اس شرح سے بورڈز میں عورتوں کی نمائندگی کے ۳۰ فی صد تک پہنچنے میں مزید ۲۰ سال لگیں گے جو تھرٹی پرسنٹ کلب کا ہدف ہے۔''[۳]

برطانیہ کی سیکس انڈسٹری کو سالانہ چار ہزار عورتوں کی فراہمی

گارجین کی ۲۲ اگست ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں انکشاف کیا گیا ہے کہ برطانیہ میں ہر سال ناقابل یقین تعداد میں عورتیں عصمت فروشی کے کاروبار کے لیے مختلف ملکوں سے لائی جاتی ہیں۔ ''مارکیٹ فورسز'' کی سرخی والی اس خبر کی ذیلی سرخی کے الفاظ ہیں:

''بہت سے مرد جنسی خواہش کی تکمیل کے لیے عورتوں کی خریداری کو محض شاپنگ کی ایک اور قسم سمجھتے ہیں، لیکن ان کا یہ طرز عمل اس کاروبار کے لیے عورتوں کی غیر قانونی تجارت اور درآمد (ٹریفکنگ) کو تیزی سے بڑھا رہا ہے''۔

رپورٹ میں کیا گیا یہ انکشاف مغربی تہذیب کے اس عظیم مرکز میں عورتوں کے مقام و مرتبے کی بلندی کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے کہ ''سرکاری اعداد و شمار سے یہ تخمینہ سامنے آتا ہے کہ برطانیہ میں ہر سال کوئی چار ہزار عورتیں سکڑتی ہوئی سرحدوں اور سیکس کی خریداری کے حوالے سے بدلتے ہوئے رویوں سے مہیا ہونے والی سہولتوں کی بناء پر فروغ پذیر سیکس انڈسٹری کی مانگ پوری کرنے کے لیے درآمد کی جاتی ہیں۔''

ان حقائق کو سامنے لانے کا سہرا CCAT نامی ادارے کے سر ہے جو کرائیڈن کمیونٹی اگینسٹ ٹریفکنگ کا مخفف ہے۔ کرائیڈن (Croydon) جنوبی لندن کا علاقہ ہے۔ یہاں وزارت داخلہ کے دفاتر واقع ہیں جن میں بارڈر اور امیگریشن ایجنسی بھی شامل ہیں لہٰذا اس علاقے میں یہ کاروبار زیادہ آسان ہے۔ نتیجہ یہ کہ گارجین کے الفاظ میں یہاں ''جنسی ہوس پوری کرنے کے لیے درآمد کی گئی عورتوں کی خریداری اتنی ہی سہل ہے جیسے پیزا کا آرڈر دینا''۔

خبر کے مطابق علاقے میں اس کاروبار کے تیزی سے پھلنے پھولنے کی وجہ سے مقامی لوگوں

نے پریشان ہوکر اپنے طور پر معاملات کی تحقیق کی کوشش کی تاہم انتقامی کارروائی کے خوف سے انہوں نے اپنی شناخت پوشیدہ رکھنے کا اہتمام کیا۔ انہوں نے سٹے بازوں کی حیثیت سے سوفجہ خانوں، حماموں (Saunas)، اوراسکارٹ ایجنسیوں کو فون کیے جن کے اشتہارات مقامی اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ اور پھر یہ جان کر ششدر رہ گئے کہ عصمت فروشی کے لیے بیچی جانے والی ۸۴ فی صد عورتیں بیرون ملک سے لائی گئی تھیں، اوران میں سے اکثر غیر قانونی طور پر خریدی اور بیچی گئی تھیں۔[۴]

مظلوم عورتوں کو ۲۰۱۱ء میں بھی قانونی تحفظ نہیں ملا

برطانیہ میں عورتوں کی یوں بے روک ٹوک تجارتی سطح پر درآمد اور انہیں عصمت فروشی پر مجبور کیے جانے کے خلاف آواز اٹھائی گئی اور حکومت نے انسانی ٹریفکنگ کے خلاف ۲۰۱۱ میں قانون سازی بھی کی لیکن ماہرین کے بقول یہ قانون سازی برطانیہ میں جبری عصمت فروشی کے لیے عورتوں کی درآمد پر اثر انداز نہیں ہوگی بلکہ روزگار کے لیے برطانیہ کا رخ کرنے والے عام تارکین وطن کی آمد کو روکنے تک محدود رہے گی۔

گارجین کی ۲ جولائی ۲۰۱۱ء کی اشاعت میں New trafficking laws 'will not care for slavery victims' کی سرخی کے تحت ہیومن ٹریفکنگ فاؤنڈیشن کے سربراہ اور ۲۰۱۰ء تک پارلیمنٹ کے رکن رہنے والے انتھونی اسٹین کا بیان عصمت فروشی پر مجبور کردی جانے والی درآمد شدہ عورتوں کے حوالے سے حقیقت واضح کرتا ہے۔ انتھونی نے اس مسئلے کے حل کے لیے کل جماعتی پارلیمانی گروپ بھی بنایا تھا۔ تاہم اس ضمن میں بننے والے قانون پر ان کا کہنا تھا کہ یہ بات باعث افسوس ہے کہ انسانی تجارت کی روک تھام کے لیے تشکیل دی جانے والی حکمت عملی میں اصل زور بے بس عورتوں کے مسئلے کے بجائے سیاسی معاملات پر دیا گیا ہے۔ ان کے بقول:

''حکومت کی جانب سے انسانی تجارت کے مسئلے کو ترجیح دینے کا دعویٰ حقیقت کی عکاسی نہیں کرتا، انسانی ہمدردی کے نقطہ نظر سے اس قانون کو تارکین وطن کے بجائے انسانوں کی تجارت کرنے

والوں کے خلاف اور ان کا نشانہ بننے والوں کے لیے ہمدردی پر مبنی ہونا چاہیے تھا۔'' ۵

برطانیہ میں عورتوں پر گھروں میں تشدد

مغرب کی تہذیبی اقدار کے مثالی مرکز انگلستان میں عورتوں کے ساتھ گھروں میں ان کے شوہروں یا بوائے فرینڈز وغیرہ کی جانب سے جو سلوک روا رکھا جاتا ہے، اس بارے میں سرکاری اور دیگر معتبر ذرائع کے فراہم کردہ کچھ اہم اعداد و شمار ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں:۶

- ۴۵ فی صد عورتیں کسی نہ کسی نوعیت کے گھریلو تشدد کے تجربے سے گزرتی ہیں، جنسی زیادتی یا خوف زدہ کیا جانا۔۷
- تقریباً ۲۱ فی صد لڑکیاں بچپن میں کسی نہ کسی قسم کی جنسی زیادتی کا شکار ہوتی ہیں۔۸
- ہر سال کم از کم ۸۰،۰۰۰ عورتیں زنا بالجبر کا نشانہ بنتی ہیں۔۹
- ایمنسٹی انٹرنیشنل کے ایک سروے کے مطابق سوال کا جواب دینے والے چار میں سے ایک شخص کا خیال تھا کہ زنا بالجبر کا نشانہ بننے والی عورت اس عمل کی جزوی یا کلی طور پر خود ذمہ دار ہے اگر اس نے جنسی خواہش کو بھڑکانے یا جسم کو نمایاں کرنے والا لباس پہن رکھا ہو اور ہر پانچ میں سے ایک شخص اسی نقطہ نظر کا حامی تھا اگر کوئی عورت متعدد افراد سے جنسی تعلق رکھتی ہو۔۱۰
- انگلستان اور ویلز میں ہر ہفتے دو عورتیں اپنے کسی متشدد مرد دوست یا سابق دوست کے ہاتھوں قتل ہو جاتی ہیں۔ یوں گھروں میں ماری جانے والی تقریباً ۴۰ فی صد عورتیں اسی طرح قتل ہوتی ہیں۔۱۱
- گھریلو تشدد کے ۷۰ فی صد واقعات کا نتیجہ زخمی ہونے کی شکل میں نکلتا ہے جبکہ جان پہچان والوں کے تشدد میں یہ تناسب ۵۰ فی صد، اجنبی لوگوں کے تشدد میں ۴۷ فی صد اور راہ زنی کے واقعات میں ۲۹ فی صد دیکھا گیا۔۱۲
- جبری شادیوں کا ہدف بننے والوں میں ۸۵ فی صد عورتیں ہوتی ہیں۔۱۳

• گھریلو تشدد پر، اس کا نشانہ بننے والوں کے ذاتی خرچ کے علاوہ علاج معالجے اور ریاست کے مجموعی اخراجات کا تخمینہ ۲۳ بلین پاؤنڈ سالانہ ہے۔[۱۴]

پالتو کتے پر تشدد قابل مذمت عورتوں پر نہیں

گھروں کے اندر عورتوں پر تشدد کو برطانوی معاشرے میں جس طرح قبول کرلیا گیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ بی بی سی کی جانب سے ۱۸ فروری ۲۰۰۳ء کو پیٹر گلاوڈ کی Scale of domestic abuse uncovered یعنی ''گھریلو تشدد کا پیمانہ بے نقاب'' کے زیرعنوان پیش کردہ ایک سروے رپورٹ میں بتایا گیا کہ ۷۸ فی صد مردوں اور عورتوں نے کہا کہ اگر ان کے پڑوس میں کوئی شخص اپنے پالتو کتے کو پیٹ رہا ہوگا تو وہ پولیس کو اطلاع دے کر اسے بچانے کی کوشش کریں گے جبکہ کسی گھر میں کسی مرد کی جانب سے اپنی بیوی یا دوست عورت پر تشدد کیے جانے کی صورت میں پولیس کو اطلاع دینے پر صرف ۵۳ فی صد نے آمادگی ظاہر کی۔[۱۵]

گھر، عورتوں کے لیے سب سے خطرناک جگہ

اس تکلیف دہ اور شرمناک صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز برطانوی دانشور اور تجزیہ کار Ian Sinclair ''عورتوں کے خلاف تشدد'' (Violence Against Women) کے زیرعنوان اپنے تجزیے میں کہتے ہیں:

''عورتوں کو درپیش خطرات کے حوالے سے ہمیں پورے معاملے پر ازسرنو سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ مین اسٹریم میڈیا اگرچہ مسلسل اجنبیوں کے خطرے کا غوغا برپا کیے ہوئے ہے مگر فی الحقیقت عورت کے لیے سب سے خطرناک جگہ اس کا اپنا گھر ہے۔ اکثر اسے آرام دہ اور محفوظ جنت تصور کیا جاتا ہے لیکن عملاً یہ ایسی جگہ ہے جہاں اُسے خوف، زخم اور بعض اوقات موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جیسے کہ برطانیہ میں ہر ہفتے دو عورتیں اپنے موجودہ یا سابقہ مرد آشناؤں کے ہاتھوں قتل ہوتی ہیں۔''[۱۶]

گھروں میں یہ سب کچھ کیوں کر ممکن ہوتا ہے؟

اس گتھی کو سلجھاتے ہوئے یونیورسٹی آف بریسٹول کے وائلنس اگینسٹ ویمن ریسرچ گروپ کی ڈائرکٹر گل ہیگ Gill Hague کہتی ہیں:

''گھر بہرصورت بند دروازوں کے پیچھے، عام لوگوں کی نگاہوں سے دور، پرائیویسی اور دوسرے لوگوں کے معاملات میں عدم مداخلت کے گفتہ و ناگفتہ قوانین کے فراہم کردہ تحفظ کا حامل ہے۔''[۱۷]

آبروریزی کے مجرموں کی سزایابی کی شرح میں مسلسل کمی

برطانوی وزارت داخلہ کی ایک رپورٹ کے مطابق جو گارجین کی ۲۱ جولائی ۲۰۰۷ء کی اشاعت میں ''آبرو ریزی کے مجرموں کی سزایابی کی شرح میں اضافے کی کوششیں ناکام'' (Efforts fail to improve rape conviction rates) کے عنوان سے شائع ہوئی، بتایا گیا ہے کہ عورتوں کی آبرو ریزی کے مجرموں کی سزایابی کی شرح پست ترین سطح تک گر چکی ہے۔ Sandra Laville کی اس رپورٹ کے مطابق حکومت، پولیس اور پراسیکیوٹرز کی کوششوں کے باوجود اس شرح میں اضافہ نہیں ہو رہا اور کئی سال سے یہی کیفیت ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء میں پولیس کو رپورٹ کیے جانے والی عصمت دری کی وارداتوں میں سے صرف چھ فی صد ملزمان کو سزا ہوئی جبکہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں یہ شرح ۳۲ فی صد تھی۔[۱۸]

آبرو ریزی کے مجرموں کی سزایابی کی اتنی کم شرح پر Rape: a history from 1860 to present نامی کتاب کی مصنفہ Joanna Bourke لکھتی ہیں: ''عصمت دری کے جن مجرموں کے مقدمات کا نتیجہ سزا کی شکل میں نکلے انہیں اپنے آپ کو استثنائی طور پر بدقسمت سمجھنا چاہیے۔''[۱۹]

اس کے ساتھ ساتھ جنسی جارحیت کا نشانہ بننے والی خواتین کی دیکھ بھال کے مراکز کی تعداد اور ان کے لیے مختص کی جانے والی رقم میں بھی مسلسل کمی ہو رہی ہے۔ گارجین میں تین جولائی ۲۰۰۷ء کو شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق انگلستان اور ویلز میں ریپ کرائسز سنٹرز کی تعداد ۱۹۸۵ء میں ۸۴ تھی جو ۲۰۰۷ء میں گھٹ کر صرف ۳۲ رہ گئی اور ان میں سے بھی نصف کو قلت

وسائل کے سبب بندش کے خطرے کا سامنا تھا۔[۲۰]

لندن میٹرو پولیٹن یونیورسٹی میں جنس زدہ تشدد کے مضمون کی پروفیسر Liz Kelly نشاندہی کرتی ہیں کہ اس عرصے میں پول ڈانسنگ کلبوں کی تعداد بڑھ کر تین گنا ہوگئی ہے جس سے برطانوی معاشرے کی موجودہ ترجیحات واضح ہیں۔

امریکہ میں خواتین سے سلوک

یکساں کام کی اُجرت مردوں سے ۳۳ فی صد کم

امریکہ کی نیشنل آرگنائزیشن فار ویمن کی جانب سے ''امریکہ میں محنت کش عورتوں کے کام کے حالات یورپ کے مقابلے میں ابتر ہیں'' کے عنوان سے پیش کی گئی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق، جو فروری ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آئی جسے Riley Karbon اور Field Intern نے مرتب کیا ہے، امریکہ میں ایک ہی نوعیت کے جس کام کے لیے مرد کارکن کو ایک ڈالر دیا جاتا ہے، خاتون ورکر کے لیے اسی کام کی اجرت ۷۷ سینٹ ہے حالانکہ ورک فورس میں اب امریکہ میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے اور یہ حقیقت رپورٹ کے مطابق محکمہ محنت کے ان ہی دنوں جاری کردہ ڈیٹا سے واضح ہے۔[۲۱]

چنانچہ نیشنل آرگنائزیشن فار ویمن نے ۱۲ اپریل ۲۰۱۱ء کو عورتوں اور مردوں کی اجرتوں کے فرق کے خاتمے کا دن منایا۔ اس موقع پر تنظیم کی صدر ٹیری اونیل (Terry O'Neill) نے بیان دیتے ہوئے کہا:

''فی الوقت عورتوں کو مردوں کے ایک ڈالر کے مقابلے میں ۷۷ سینٹ ادا کیے جاتے ہیں۔ ذرا سوچیے، پورے سال کل وقتی ملازمتیں کرنے والی محنت کش خواتین کارکنان، دو دہائیوں سے مردوں کے مقابلے میں ۷۰ اور ۸۰ فی صد کے درمیان تنخواہوں پر رکی ہوئی ہیں۔ مساوی اجرت کا دن اس عدم مساوات کے خلاف ایک پرزور یاددہانی ہے۔ یہ دن اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ نئے سال میں متوسط درجے کی عورتوں کو وہ رقم حاصل کرنے کے لیے لازمی طور پر کتنا کام کرنا

ہوگا جو متوسط درجے کے مردوں کو پچھلے سال ادا کی جا چکی ہے۔ اس امر پر بھی خصوصی توجہ دی جانی چاہیے کہ رنگ دار عورتوں کی تنخواہیں، نسلی امتیاز کی وجہ سے اوسط سے اور بھی پیچھے ہیں۔'' [۲۲]

عورتوں پر تشدد: اقوام متحدہ کی نمائندہ خصوصی کی رپورٹ

امریکہ میں عورتوں پر تشدد کے ہمہ پہلو جائزے کے لیے ۲۴ جنوری سے ۷ فروری ۲۰۱۱ء تک اقوام متحدہ کی ہیومن رائٹس کونسل کے خصوصی نمائندے کی حیثیت سے پروفیسر راشدہ منجو نے امریکہ کا مطالعاتی دورہ کیا۔ اس سے پہلے ۲۰۰۹ء میں بھی وہ تین ماہ کے لیے اس تحقیقی مشن پر کام کر چکی تھیں۔ راشدہ منجو جنوبی افریقہ میں ہائی کورٹ کی وکیل ہیں اور امریکہ کی ویسٹر یونیورسٹی میں معلّمی کے فرائض بھی انجام دیتی رہی ہیں۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں انہوں نے ''عورتوں کے خلاف تشدد، اس کی وجوہات اور نتائج و اثرات'' کے عنوان سے یہ رپورٹ دس اکتوبر ۲۰۱۱ء کے اجلاس میں پیش کی جس کی خبر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ہائی کمشنر کے دفتر کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ [۲۳]

اس مفصل رپورٹ میں پیش کیے گئے کچھ اہم واقعاتی حقائق اور اعداد و شمار یہ ہیں: [۲۴]

شوہروں اور دوستوں کے ہاتھوں تشدد

گھریلو تشدد یعنی شوہروں یا مرد آشناؤں یا دوستوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہونے والے تشدد کے ضمن میں رپورٹ میں کہا گیا ہے ''گھریلو تشدد یا قریبی ساتھیوں کی جانب سے ہونے والا تشدد انسانی حقوق کی ایسی خلاف ورزی ہے جو امریکہ کے طول و عرض میں وسیع پیمانے پر جاری ہے۔ نیشنل کرائم وکٹی مائزیشن سروے کے مطابق ۲۰۰۸ء میں امریکہ میں عورتوں پر مرد ساتھیوں کی جانب سے تقریباً ۵,۵۲,۰۰۰ پُرتشدد جرائم کا ارتکاب کیا گیا۔ ان میں ۳۵,۶۹۰ زنا بالجبر یا جنسی زیادتی کی وارداتیں، ۳۸,۸۲۰ ڈکیتیاں، ۷۰,۵۵۰ شدید طور پر زخمی کرنے والے حملے، اور ۴,۰۶,۵۳۰ نسبتاً کم جسمانی نقصان پہنچانے والے حملے شامل ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۸ء

میں اوسطاً ہر روز ۵۰۰ عورتیں جنسی حملوں کا نشانہ بنیں۔ تشدد کے واقعات کی شرح عورتوں میں ۴٫۳ فی ہزار اور مردوں میں ۰٫۸ فی ہزار رہی۔ (پیراگراف: ۸)

۲۰۰۷ء میں قتل ہونے والی عورتوں میں سے ۶۴ فی صد اپنے قریبی مرد دوستوں یا گھر کے کسی فرد کے ہاتھوں ماری گئیں۔ ان میں سے ۲۴ فی صد واقعات کے مرتکب ان عورتوں کے موجودہ یا سابق شوہر ہوئے، ۲۱ فی صد واقعات بوائے فرینڈز یا گرل فرینڈز کے ہاتھوں پیش آئے جبکہ ۱۹ فی صد واقعات میں خاندان کا کوئی دوسرا فرد ملوث پایا گیا۔ اس سال قریبی دوستوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی شرح ایک لاکھ عورتوں میں ۰٫۷ جبکہ ایک لاکھ مردوں میں ۰٫۴۷ رہی۔ (پیراگراف ۹)

رپورٹ میں وضاحت کی گئی ہے کہ یہ اعداد و شمار حقیقی صورت حال کی مکمل عکاسی نہیں کرتے کیونکہ قریبی ساتھیوں کی جانب سے ہونے والے تشدد اور جنسی زیادتی کی وارداتیں خوف و ہراس اور دیگر وجوہ کی بناء پر بہت ہی کم رپورٹ کی جاتی ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۲ء سے ۲۰۰۰ء تک زنا بالجبر کے صرف ۳۶ فی صد، جنسی زیادتی کی کوشش کے ۳۴ فی صد اور جنسی حملوں کے ۲۶ فی صد واقعات پولیس کو رپورٹ کیے گئے۔ (پیراگراف: ۱۷)

جیلوں میں بدسلوکی

امریکی جیلوں میں عورتوں سے بدسلوکی کی تفصیلات، اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل کی خصوصی نمائندہ کی چشم کشا رپورٹ کے کئی صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت کی جانب سے بہتری کی کوششوں کے باوجود اب تک امریکی جیلوں میں قید عورتیں ہر قسم کی زیادتیوں کا نشانہ بن رہی ہیں۔ ان تفصیلات کا خلاصہ بھی بہت جگہ چاہتا ہے اس لیے محض چند اقتباسات پر اکتفا کر رہے ہیں جن سے مجموعی صورت حال کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ رپورٹ میں اگرچہ تقریباً پچھلے ڈیڑھ عشرے کے حالات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے لیکن ہم حالیہ چند برسوں کی کیفیت کے حوالے سے رپورٹ کے مندرجات نقل کر رہے ہیں، ملاحظہ فرمائیے:

''جہاں تک جیلوں میں عورتوں کے ساتھ جنسی بدسلوکی کا تعلق ہے، تو ۲۰۰۹-۲۰۰۸ء کی

ایک رپورٹ نشاندہی کرتی ہے کہ بارہ مہینوں کی مدت میں امریکی جیلوں میں ۴ء۷ فی صد عورتوں کو اپنے مرد قیدی ساتھیوں اور ۲ء۱ فی صد کو جیل کے عملے کے ارکان کے ہاتھوں مختلف نوعیت کی جنسی بدسلوکی، زیادتی، خوف و ہراس اور جنسی حملوں کا تجربہ ہوا۔ انسپکٹر جنرل کے دفتر سے جاری ہونے والی ۲۰۰۹ء کی ایک رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ جیل کے عملے کے مرد ارکان اکثر قیدی عورتوں کی جامہ تلاشی کے دوران جنسی چھیڑ چھاڑ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ عملے کے یہ ارکان اپنے اختیارات اور طاقت کے بل پر قیدی عورتوں کو زبردستی جنسی تعلق پر مجبور کرتے ہیں۔''

''قیدی عورتوں کے جیل کے ساتھیوں سے انٹرویوز سے پتہ چلا کہ قیدی عورتیں بعض اوقات ٹیلیفون تک رسائی، کھانے پینے کی اشیاء اور صابن اور شیمپو جیسی چیزوں کے حصول تک کے لیے جنسی زیادتی قبول کرنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان میں سے بہت سی پوری زندگی کے لیے ذہنی انتشار، بے چینی اور ڈپریشن جیسے نفسیاتی امراض میں مبتلا ہوجاتی ہیں، حتیٰ کہ ان تلخ اور ذلت آمیز واقعات کو بھلا نہ پانے کی بناء پر ان میں سے بہت سی عورتیں خودکشی تک کر گزرتی ہیں۔ (پیراگراف: ۳۳-۳۲)[۲۵]

فوج میں جنسی زیادتی روز کا معمول

درج بالا سرخی کے تحت رپورٹ میں کہا گیا ہے: '' فوج کے اندر عورتوں پر جنسی حملے اور انہیں خوف زدہ کرنے کو عورتوں کے خلاف تشدد کی ایک وسیع قسم کے طور پر امریکہ میں بلا تامل تسلیم کیا جاتا ہے۔ وکلاء بتاتے ہیں کہ عورتیں جب فوج کی ملازمت اختیار کرتی ہیں تو وہ نہ صرف جنگ و جدل کے حوالے سے جسمانی خطرات مول لیتی ہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کی جانب سے جنسی حملوں کے خطرے کا سامنا بھی کرتی ہیں۔ جنسی حملوں کا سامنا اگرچہ مردوں اور عورتوں دونوں کو کرنا پڑتا ہے، تاہم دستیاب اعداد شمار ظاہر کرتے ہیں کہ نشانہ بننے والوں میں سے بھاری اکثریت جونیئر رینکس کی ۲۵ سال سے کم عمر عورتوں کی ہوتی ہے۔ (پیراگراف: ۲۲)

صورت حال کی سنگینی کا اندازہ رپورٹ میں کیے گئے اس انکشاف سے لگایا جاسکتا ہے کہ

امریکی فوج میں عورتوں کو درپیش ناگفتہ بہ صورت حال پر دو سابق وزرائے دفاع کے خلاف اجتماعی مقدمات بھی دائر کیے گئے ہیں۔ اس حوالے سے رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''سابق وزرائے دفاع ڈونلڈ رمز فیلڈ اور رابرٹ گیٹس کے خلاف، آبرو ریزی اور جنسی حملوں کی شکایات پر کارروائی نہ کرنے، ان کی تحقیقات نہ کرانے، مجرموں کو سزا دینے میں ناکام رہنے اور انصاف کی فراہمی کے نظام کو کمزور رکھنے پر متاثرین کی جانب سے اجتماعی مقدمے کے بارے میں بھی خصوصی نمائندے کو بتایا گیا۔ مقدمے میں یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ عصمت دری اور جنسی حملوں کا نشانہ بننے والوں کے خلاف کھلم کھلا خوف زدہ کرنے اور نقصان پہنچانے کی کارروائیاں کی گئیں، جرائم کی شکایت درج کرانے کے معاملے میں ان کی حوصلہ شکنی کی گئی، نیز انہیں اپنی زبان بند رکھنے اور جو زیادتی ان کے ساتھ ہوئی اسے کسی کو نہ بتانے کا حکم دیا گیا۔ (پیراگراف:۲۳)

امریکہ میں عورتوں کے خلاف تشدد خصوصاً جنسی زیادتی اور جرائم پر مبنی اقوام متحدہ کی نمائندہ خصوصی کی اس رپورٹ کے اگلے پیراگراف میں اس حقیقت کی نشان دہی کی گئی ہے کہ فوج میں ہونے والے اس نوعیت کے جرائم عام طور پر ریکارڈ پر نہیں آتے کیونکہ متاثرین چپ رہنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''کیونکہ فوج میں جنسی حملوں کے بیشتر واقعات کی رپورٹ درج نہیں کرائی جاتی لہٰذا درست اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں۔ محکمہ دفاع کے مطابق، تازہ ترین بے نام سروے سے پتہ چلتا ہے کہ ایکٹو ڈیوٹی عورتوں میں سے ۴ء۴ فی صد اور ایکٹو ڈیوٹی مردوں میں سے ۹ء فی صد نے اشارہ دیا کہ وہ سروے سے پہلے کے بارہ ماہ کے دوران جبری جنسی تعلق کے تجربے سے گزرے ہیں۔ ان میں سے صرف ۲۹ فی صد عورتوں اور ۱۴ فی صد مردوں نے بتایا کہ انہوں نے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کی شکایت محکمہ دفاع یا کسی سول اتھارٹی سے کی ہے۔ (پیراگراف:۲۴)

فوج میں عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی کے واقعات کی رپورٹنگ کے اس قدر کم ہونے کے

اسباب بیان کرتے ہوئے اقوام متحدہ کی نمائندہ خصوصی کی اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ فوج کے تحکمانہ نظام کی وجہ سے زیادتی کا شکار ہونے والے شکایت کرنے کی صورت میں اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھنے کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ اگر زیادتی کے ذمہ دار، متاثرہ فرد کے افسران میں سے ہوں تو ان کے خلاف شکایت کرنا محال کو ممکن بنانے کی کوشش کے مترادف ہوتا ہے اور متاثرین اکثر محسوس کرتے ہیں کہ انہیں اپنی فوجی ملازمت یا انصاف میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ (پیراگراف : ۲۷) رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ متاثرین کے وکلاء نے بتایا کہ شکایت کرنے کی صورت میں متاثرین بااثر ملزمان کی جانب سے انتقامی کارروائی کا خوف رکھتے ہیں کیونکہ کمانڈر عام طور پر شکایت کرنے والوں کو ملزمان کے انتقامی اقدامات سے تحفظ مہیا کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ (پیراگراف:۲۸)

خاتون رکن کانگریس کی گواہی

سی این این کی ۳۱ جولائی ۲۰۰۸ء کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے:

''کانگریس کی ایک خاتون رکن کے بقول اُن کا منہ اس وقت کھلا کا کھلا رہ گیا جب سابق فوجیوں کے ایک اسپتال میں فوجی ڈاکٹروں نے انہیں بتایا کہ دس میں سے چار عورتوں نے شکایت کی ہے کہ فوجی ملازمت کے دوران انہیں جنسی حملوں کا نشانہ بنایا گیا۔ جبکہ ایک سرکاری رپورٹ کی رو سے یہ تعداد اس سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ ڈی کیلیفورنیا سے کانگریس کی رکن جین ہرمین نے یہ انکشاف کانگریس کے ایک پینل کے سامنے بیان دیتے ہوئے کیا جو یہ تحقیق کررہا ہے کہ فوج میں جنسی زیادتیوں کے واقعات سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ جین ہرمین نے بتایا کہ انہوں نے حال ہی میں لاس اینجلس میں سابق فوجیوں کے ایک اسپتال کا دورہ کیا، جہاں انہیں فوج میں عورتوں کی آبروریزی کی خوفناک کہانیاں سنائی گئیں۔''

جین ہرمین کے مطابق جنسی حملوں کا نشانہ بننے والی ان عورتوں میں سے ۲۹ فی صد نے انکشاف کیا کہ فوجی ملازمت کے دوران ان کی عزت لوٹی گئی۔ ان عورتوں نے اپنے مستقل خوف،

بے بسی کے احساس اور مسلسل ابتر ہوتی نفسیاتی کیفیت کے بارے میں بتایا جس میں وہ اسی وقت سے مبتلا ہیں جب انہیں اس ظلم کا ہدف بنایا گیا۔''

جین ہرمین نے صورت حال کی سنگینی کو یوں واضح کیا: ''ہماری فوج میں یہ چیز ایک وباء کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ امریکی فوج میں ملازمت کرنے والی عورتیں آج عراق میں دشمن کی گولی سے مرنے سے کہیں زیادہ اپنے مرد ساتھیوں کے ہاتھوں آبروریزی کے خطرے سے دوچار ہیں۔''

امریکی کانگریس کی اس خاتون رکن کے بقول ۲۰۰۷ء میں فوج کے اندر جنسی حملوں کے ۲۲۱۲ کیس رپورٹ ہوئے مگر ان میں سے صرف ۱۸۱ یعنی محض ۸ فی صد کورٹ مارشل کے لیے بھیجے گئے۔ جین ہرمین نے بتایا کہ اس کے مقابلے میں شہری معاشرے میں ایسے معاملات کے عدالتوں تک پہنچنے کی شرح ۴۰ فی صد ہے۔ ۲۶

متاثرہ عورتیں زندہ درگور

امریکی فوج میں اپنے مرد ساتھیوں کی بہیمانہ ہوس کا نشانہ بننے والی ان عورتوں کی دادرسی کس حد تک ہوتی ہے اور اپنی بقیہ زندگی میں انہیں کن ذہنی، نفسیاتی اور سماجی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، دستیاب واقعاتی حقائق سے اس کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ امریکی فوج میں عورتوں کے ساتھ جنسی زیادتی پر امریکی اخبار ڈینور پوسٹ (Denver Post) سے وابستہ ایمی ہرڈی (Amy Herdy) اور مائلز موفیٹ (Miles Moffeit) نے نو ماہ کی تحقیق کے بعد ایک رپورٹ تیار کی جو اخبار کی ۱۶ تا ۱۸ نومبر ۲۰۰۳ء کی اشاعتوں میں بالاقساط شائع ہوئی۔ ۲۰۰۴ء میں اسے Betrayal in the Ranks کے عنوان سے مستقل دستاویز کے طور پر بھی شائع کیا کر دیا گیا۔

ڈینور پوسٹ کی اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ امریکی فوج میں اپنے مرد ساتھیوں کی ہوس کا نشانہ بننے والی ان مظلوم عورتوں کی دادرسی کے بجائے عموماً انہیں خاموش رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان کے خلاف جنسی تشدد کے مرتکب مجرموں کو عام طور پر کسی باز پرس اور سزا کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ رپورٹ میں کولوریڈو ایئر فورس اکیڈمی کے اسکینڈل کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ

۱۴۲ کیس رپورٹ ہونے کے باوجود ایک ملزم کو بھی سزا نہیں دی گئی۔

ان رپورٹروں نے ایسی مزید مثالیں دیتے ہوئے لاس ویگاس میں ۱۹۹۱ء میں ہونے والے نیوی ٹیل ہک کنونشن کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق اس موقع پر سو سے زائد افسروں نے درجنوں خاتون اہلکاروں کو جنسی طور پر ہراساں کیا مگر جب اس سلسلے میں نیوی کی طرف سے انکوائری ہوئی تو مجرم افسروں نے تحقیقاتی عمل کو بالکل سبوتاژ کر کے رکھ دیا اور ان میں سے ایک کو بھی سزا نہیں دی جا سکی۔

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ امریکہ کا فوجی نظام یہ رعایت جن مجرموں کو دے رہا ہے، ان کے جرم کے اثرات و نتائج کیا ہیں اور جو عورتیں ان کی درندگی کا نشانہ بنتی ہیں، ان کی بقیہ زندگی کس طرح گزرتی ہیں۔ ڈینور پوسٹ نے اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے ایسی ۶۰ عورتوں سے بات چیت کی جنہوں نے انتقام کے خوف یا مجرموں کے خلاف کسی کارروائی سے مایوس ہونے کی بناء پر اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی کہیں رپورٹ درج نہیں کرائی تھی۔

اخبار لکھتا ہے کہ مجرمانہ حملوں کا نشانہ بننے والی درجنوں سابق فوجی خواتین اہلکاروں نے بتایا کہ اذیت کے اندرونی احساس کے سبب ان کے کیریئر تباہ ہو گئے۔ انہوں نے منشیات اور کثرت شراب نوشی میں پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کی جس سے ان کی زندگیاں برباد ہو گئیں۔

ماریان ہڈ ایسی ہی ایک مظلوم سابق امریکی سپاہی ہے۔ اس نے اپنے کرب کا اظہار جن الفاظ میں کیا وہ دل دہلا دینے والے ہیں، ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امریکی فوج میں عورتوں کے ساتھ روا رکھا جانے والا شرمناک اور وحشیانہ سلوک کس طرح خود امریکہ کے خلاف نفرت کے فروغ کا سبب بن رہا ہے۔ سابق فوجی ہونے کے باوجود امریکی پرچم لہرانے سے انکار کرنے والی ماریان ہڈ کہتی ہے:

''پہلے جب میں امریکی پرچم پر نظر ڈالتی تو یہ مجھے سرخ، سفید اور نیلا دکھائی دیتا تھا، مگر اب میں اس پر صرف خون کے رنگ دیکھتی ہوں۔ سرخ رنگ اس خون کی علامت ہے جو میرے بدن

سے بہا۔ نیلا رنگ ان چوٹوں کی نمائندگی کرتا ہے جو میرے جسم نے سہیں۔اور سفید رنگ میرے خوفزدہ چہرے کا ہے۔ میں اپنے ملک کے لیے ماری پیٹی گئی اور میری عزت لوٹی گئی۔ اسے کافی سمجھا جانا چاہیے۔''[۲۷]

مغربی عورت کا حال زار: فطرت سے بغاوت کا نتیجہ

مغربی تہذیب نے ماں باپ، اور شوہر و بیوی کی حیثیت سے عورت اور مرد کے فطری دائرہ کار، صنفی وجسمانی تقاضوں اور نفسیاتی و جذباتی مطالبات کے کھلے فرق کو نظر انداز کر کے زندگی کے ہر میدان میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ لا کھڑا کرنے کی جو غلطی کی تھی، مغرب کی عورت کو درپیش مسائل اور ذلت انگیز حالات، جن کا کچھ ذکر سطور بالا میں ہوا، فی الحقیقت اسی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ مغربی عورت گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ مردوں کی طرح معاشی جدوجہد میں بھی جوت دی گئی ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے ساتھ کام ضرور کر رہی ہے لیکن عملاً وہ مردوں کا دل بہلانے کا کھلونا بن گئی ہے۔اس طرز زندگی کے کئی عشروں کے تجربے نے مغربی عورت پر یہ حقیقت روشن کر دی ہے کہ آزادی و مساوات کے نام پر یہ سودا اسے بہت مہنگا پڑا ہے۔ لہٰذا آج مغربی عورت دوبارہ گھر کی پناہ گاہ میں واپس جانے کی آرزومند ہے۔

مغربی عورتوں میں اسلام کی حیرت انگیز مقبولیت کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ اسلامی تعلیمات عورت کو گھر کا مرکز بناتی ہیں اور معاشی جدوجہد میں شرکت کی کوئی ذمہ داری اس پر عائد کیے بغیر محبت، عزت اور احترام کا وہ مقام دیتی ہیں، جس کا کوئی تصور مغربی معاشرے میں نہیں پایا جاتا۔ مسلمان ہونے والی مغربی خواتین اپنے قبول اسلام کے اسباب میں اسلام کے ان اوصاف کا عموماً بطور خاص ذکر کرتی ہیں۔ تاہم ذیل میں اس حوالے سے کئی ہزار برطانوی عورتوں کی ایک کھلی گواہی پیش کی جا رہی ہے جو ہر معقول شخص کے لیے سوچ بچار کا بڑا سامان رکھتی ہے۔

۹۴فی صد برطانوی عورتیں سپر وومین رول ماڈل سے بیزار

برطانیہ کی خواتین بیک وقت گھریلو ذمہ داریوں اور ملازمت کی ذمہ داریوں کو بھاری بوجھ محسوس کرتی ہیں۔ خواتین کے بہت سے میگزین اکثر ایسی آراء اور معلومات پیش کرتے رہتے ہیں۔ مثال کے طور پر ٹاپ سانتے (Top Sante) نامی برطانوی میگزین کے ایک سروے کے مطابق، جس کی تفصیلات ہم نے برطانوی اخبار ڈیلی میل میں شائع ہونے والی رپورٹ سے لی ہیں، برطانیہ کی ۹۴فی صد ملازمت پیشہ خواتین کا کہنا ہے کہ وہ زوجیت، مادریت اور ملازمت کے تقاضے بیک وقت پورے کرتے کرتے بے دم ہو چکی ہیں اور اس سپر وومن رول ماڈل سے نجات کی آرزومند ہیں۔

میگزین کی ایڈیٹر جولیٹ کیلو (Julliet Kellow) جنہوں نے برطانیہ، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور شمالی آئرلینڈ کی پانچ ہزار ملازمت پیشہ عورتوں کے انٹرویو کا اہتمام کر کے یہ جائزہ پیش کیا ہے، کہتی ہیں: "It is time for super woman to put back in her box" یعنی وقت آ گیا ہے کہ سپر وومن واپس اپنے گھر کا رخ کرے اور اپنی اصل ذمہ داریاں نبھائے۔

سروے میں کہا گیا ہے کہ سپر وومن کا یہ رول ماڈل ان عام عورتوں کے لیے قطعی سازگار نہیں جن کے پاس گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹانے کے لیے بچے کھلانے والی اناؤں، صفائی ستھرائی کرنے والی خادماؤں، پرسنل سکریٹریوں اور ہیئر ڈریسروں وغیرہ کی فوج نہیں ہے۔ سروے کے مطابق ہر دس میں سے آٹھ ملازمت پیشہ عورتوں کا خیال ہے کہ ماں اور باپ دونوں کی کل وقتی ملازمت خاندانوں کے ٹوٹنے کا ایک بڑا سبب ہے۔ سروے میں بتایا گیا ہے کہ ملازمت پیشہ عورتوں کے تعلقات اپنے شریک حیات کے ساتھ تلخ ہو جاتے ہیں کیونکہ بیشتر عورتیں سمجھتی ہیں کہ مرد اپنا بوجھ اتنا نہیں اٹھاتے جتنا اٹھا سکتے ہیں۔ یہ خیال ۸۴فی صد عورتوں نے ظاہر کیا ہے۔ اس کے باوجود ایک تہائی عورتوں کے لیے اپنی ملازمت چھوڑ کر اپنے آپ کو گھر کے لیے وقف کر دینا ممکن نہیں کیونکہ وہ اپنے شوہروں یا مرد پارٹنروں کی نسبت زیادہ کماتی ہیں۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ برطانیہ میں بھی، جو موجودہ مغربی تہذیب کا امام اول ہے اور جس

نے پوری مغربی دنیا کو اس راہ پر لگایا ہے، مساواتِ مرد وزن کے تمام دعووں کے باوجود سروے کے مطابق اب تک عورتیں ہی گھر اور خاندان کے امور کے لیے بنیادی طور پر جواب دہ اور ذمہ دار ہیں حالانکہ وہ مردوں ہی کی طرح اپنا پورا دن ملازمت کی مصروفیت میں گزار کر تھکی ہاری گھر پہنچتی ہیں۔ اپنی ان سہ طرفہ مستقل اور سخت ذمہ داریوں کی مسلسل ادائیگی نے انہیں زمین سے لگا دیا ہے۔ جولیٹ کیلو کا کہنا ہے کہ ایک کل وقتی گھریلو خادمہ، ملازمت پیشہ عورتوں کی اکثریت کے لیے دیومالائی شے ہے۔ بہتر معاوضے والی جز وقتی ملازمتیں ان گھربار والی عام ملازمت پیشہ عورتوں کے مسئلے کا ایک حد تک حل ہوسکتی ہیں لیکن یہ انتہائی کمیاب ہیں اور ان کا حصول نہایت دشوار ہے۔ سروے کے مطابق ۵۷ فی صد برطانوی کمپنیاں اب تک اپنے ہاں ملازمت کرنے والی عورتوں کو ماں بن جانے کی صورت میں کوئی رعایت اور کوئی الاؤنس نہیں دیتی ہیں خواہ ملازمت جاری نہ رکھ پانے کی وجہ سے کمپنیوں کو ان کے تجربے اور صلاحیتوں سے محروم ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔

سروے میں بتایا گیا ہے کہ گھر اور بچوں کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ملازمت کی مشقت عورتوں کی صحت کو بری طرح متاثر کر رہی ہے۔ ذہنی اور جسمانی طور پر تازہ دم ہو کر صحت مند رہنے کے لیے کم سے کم ناگزیر وقت بھی ان عورتوں کے پاس نہیں ہوتا۔ ان غریب عورتوں کا طرز زندگی پریشر ککر جیسا بن کر رہ گیا ہے۔ وہ اپنی مختلف النوع ذمہ داریوں کی بناء پر مسلسل دباؤ میں رہتی ہیں اور انہیں ایک کام سے دوسرے کام کی طرف دوڑتے رہنا پڑتا ہے چنانچہ ان کے رویے میں جارحیت بڑھتی چلی جارہی ہے۔ سروے میں ملازمت پیشہ عورتوں کی عمومی صورت حال سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ اگر مالی مجبوریاں نہ ہوں تو برطانیہ کی ۴۸ فی صد ملازمت پیشہ عورتیں صرف آرام کرنا پسند کریں گی۔ ۳۲ فی صد گھرداری اختیار کرنے کا فیصلہ کریں گی اور صرف ۲۰ فی صد ملازمت جاری رکھنے کو ترجیح دیں گی۔[۲۸]

سستی لیبر کے لیے سرمایہ داری کی چال

مغرب میں عورت کا یہ حال زار دراصل سرمایہ دارانہ نظام کی عورت کے خلاف خوفناک سازش کا نتیجہ ہے جسے آزادی نسواں کا دلکش اور پرفریب نام دیا گیا۔ اب یہ کوئی راز نہیں کہ آزادی نسواں اور مساوات مرد وزن کی تحریکوں کے نام پر عورت کو گھرداری اور نئی نسل کی پرورش اور تربیت کے فطری فریضے کی ادائیگی کے لیے فارغ رکھے جانے سے دراصل روکا ہی اس لیے گیا تھا تاکہ اسے گھر سے باہر لاکر سرمایہ داری نظام کی ضرورت کے مطابق کارخانوں اور دفاتر کے لیے سستی لیبر فراہم کی جاسکے، اور عشروں سے ان معاشروں میں عورت کا عملی کردار یہی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ فطرت سے بغاوت کے کبھی مثبت نتائج برآمد نہیں ہوتے چنانچہ مغرب، خاندانی نظام کے تقریباً مکمل خاتمے کی صورت میں آج فطرت کے خلاف کی گئی اس بغاوت کے انجام سے دوچار ہے جس پر چیخ پکار تو سنائی دیتی رہتی ہے مگر اب اس گاڑی کو ریورس گیئر لگانا بہت مشکل ہے۔

عورت کی معاشی جدوجہد، خوشحالی کا ذریعہ؟

ایک عام تصور یہ ہے کہ عورت کو چوکوں اور بازاروں میں کھینچ لانے سے مغرب کا خاندانی نظام اور گھریلو سکون چاہے کتنا ہی برباد ہوگیا ہو مگر کم از کم معاشی طور پر عام آدمی بھی بہت خوشحال ہوگیا ہے، لیکن یہ بھی بس ایک خیالِ خام ہی ہے۔ امریکہ کی وَرمونٹ یونیورسٹی کے پروفیسر ہک گٹ مین (Huck Gutman) امریکہ میں معاشی عدم مساوات کے موضوع پر اپنے ایک مقالے میں جو پاکستان کے ممتاز انگریزی اخبار ڈان میں بھی یکم جولائی ۲۰۰۲ء کو شائع ہوا، لکھتے ہیں:

''اگرچہ لگتا ہے کہ امریکہ کے لوگ ناقابل تصور امارت سے لطف اندوز ہو رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بیشتر امریکیوں کو پیٹ بھر کھانا بھی نہیں ملتا اور ایک قابل لحاظ تعداد بھوکی رہ جاتی ہے۔'' وہ کہتے ہیں کہ ''گزشتہ صدی کی آخری چوتھائی جس میں امریکی کارپوریشنوں نے پوری دنیا میں اپنی طاقت اور اثر ورسوخ بڑھا کر بھاری منافع کمایا، اس پوری مدت میں امریکی محنت کش کو کوئی اضافی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ امریکی کارکنوں کی اجرتیں ۱۹۷۸ء سے ایک ہی سطح پر برقرار

ہیں یا گھٹ رہی ہیں۔''

اس کے مقابلے میں اعلیٰ افسران کے معاوضے بڑھتے چلے گئے اور اس تحقیق کے مطابق آج کیفیت یہ ہے کہ ان کی آمدنی ایک عام کارکن سے سات سو گنا تک زیادہ ہے۔ پروفیسر گٹ مین نے اسے زیادہ آسان پیرائے میں اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک چیف ایگزیکٹو آفیسر آدھے دن میں اتنا کما لیتا ہے جو ایک مزدور سال بھر میں بھی مشکل سے کما پاتا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ امریکہ کے ایک فی صد امیر ترین لوگ، نیچے کے ۹۵ فی صد لوگوں سے زیادہ وسائل کے مالک ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اس بات پر یقین کرنا ان لوگوں کے لیے مشکل ہوگا جو ٹی وی پروگراموں میں امریکیوں کو اسپورٹس گاڑیاں چلاتے اور سجے سجائے گھروں میں بسا دیکھتے ہیں لیکن معاشی حقیقت یہ ہے کہ امریکی خاندانوں کے معیار زندگی میں جو اضافہ بھی ہوا ہے، وہ تقریباً سب کا سب عورتوں کے بڑے پیمانے پر ورک فورس میں شامل ہونے کا نتیجہ ہے، اور گھریلو اخراجات جو پہلے ایک کمانے والے کی آمدنی سے پورے ہوجاتے تھے، اب ان کے پورے ہونے کا دارومدار دو افراد کی آمدنی پر ہے۔ بچوں کی دیکھ بھال، گھر کا انتظام، کھانا پکانا، یہ چیزیں اب روزمرہ کام کا حصہ نہیں بلکہ اضافی بوجھ ہیں۔''[۲۹]

واضح رہے کہ امریکہ سمیت پوری مغربی دنیا بے انصافی پر مبنی نظام سرمایہ داری کے سبب گزشتہ کئی برس سے جس معاشی بحران کا شکار ہے، اس کی وجہ سے عام آدمی کے حالات مزید ابتر ہوئے ہیں اور امیر و غریب کے درمیان بڑھتے ہوئے تفاوت کے باعث پوری مغربی دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف عوامی احتجاج کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ عورت کا استحصال اس نظام کا ایک بنیادی وصف ہے۔ زوجیت، مادریت اور خانہ داری کے تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ مردوں کی طرح معاشی جدوجہد بھی اس کی مجبوری بنادی گئی ہے جبکہ اسلام میں مردوں اور عورتوں کے دائرہ کار واضح طور پر الگ الگ ہیں۔

اسلامی نظام میں عورت کو گھر کی پناہ گاہ سے باہر آنے پر مجبور کیے بغیر تمام حقوق حاصل

ہوتے ہیں اور اس کی مکمل کفالت اور تمام ضروریات کی تکمیل مرد کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ مسلم دنیا میں خاندان کا ادارہ اسی بناء پر آج بھی مستحکم ہے اور مسلمان معاشروں میں عورتیں بالعموم ان مسائل سے دوچار نہیں ہیں جن سے مغرب کی عورت کو شب و روز سابقہ درپیش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب کی عورت اس سپر وومن رول ماڈل سے بیزار ہوچکی ہے جس کا جھانسا دے کر اسے اپنے گھر کی جنت سے نکال کر کارگاہوں اور بازاروں کی زینت بنایا گیا ہے اور پانچ ہزار عورتوں سے انٹرویو کے بعد ان کی بھاری اکثریت کی آراء کی روشنی میں ٹاپ سانتے کی ایڈیٹر کو کہنا پڑا ہے کہ: Working women are heartily sick of these do it all role models. It is time for superwoman to be put back in her box." (ملازمت پیشہ عورتیں ہر چیز کی ذمہ داری والے اس طرز زندگی سے شدید طور پر بیزار ہوچکی ہیں، وقت آ گیا ہے کہ سپر وومن اپنے گھر واپسی کی راہ لے۔)[۳۰]

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ خدائی ہدایات سے بے نیاز ہوکر اور فطرت کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے مغربی تہذیب نے عورت کو مرد بنانے کی جو احمقانہ کوشش کی، اس کے نتیجے میں وہ نہ پوری طرح مرد بن سکی نہ پوری عورت رہ سکی۔ اس بناء پر آج وہ شدید مسائل کا شکار اور اس صورت حال سے چھٹکارے کی آرزومند ہے۔ یہ کیفیت اسلام کی جانب مغربی خواتین کے رجوع کا ایک بنیادی سبب ہے۔

.....حواشی.....

1- http://www.guardian.co.uk/society/2009/jun/05/pregnant-women-targeted-redundancy?INTCMP=ILCNETTXT3487

2- http://www.guardian.co.uk/society/2011/aug/31/cmi-equal-pay-report

3- http://www.guardian.co.uk/business/2011/oct/13/shocking-lack-women-directors-ft

4- http://www.guardian.co.uk/society/2007/aug/22/guardiansocietysupplement.crime1

5- http://www.guardian.co.uk/uk/2011/jul/02/human-trafficking-laws-immigration-control

6- http://www.whiteribboncampaign.co.uk/Resources/violence_against_women

7- Walby, S. & Allen, J. (2004) Domestic violence, sexual assault and stalking: Findings from the British Crime Survey. Home Office. London.

8- HM Government (2007) Cross-government Action Plan on Sexual Violence and Abuse. Home Office. London.

9- Walby, S. & Allen, J. (2004) Domestic violence, sexual assault and stalking: Findings from the British Crime Survey. Home Office. London.

10- Amnesty UK (2005) Sexual Assault Research. Amnesty.

11- Povey, D. (2005) Crime in England and Wales 2003/2004: Supplementary Volume 1: Homicide and Gun Crime. Home Office Statistical Bulletin No. 02/05. Home Office. London; Department of Health (2005) Responding to Domestic Abuse. DH. London. (from 'Statistics on Domestic Violence': www.womensaid.org.uk)

12- Dodd, T. et al (2004) Crime in England and Wales 2003-2004. Home Office. London (from 'Statistics on Domestic Violence'

www.womensaid.org.uk

13- Forced Marriage: A Wrong not a Right, Home Office and Foreign & Commonwealth Office, 2005

14- S Walby, The Cost of Domestic Violence

15- http://news.bbc.co.uk/2/hi/uk_news/2752567.stm

16- http://zcommunications.org/violence-against-women-by-ian-sinclair

17- Gill Hague and Ellen Malos, Domestic violence. Action for change (New Clarion Press, Cheltenham, 2005), p. 6.

18- http://www.guardian.co.uk/uk/2007/jul/21/ukcrime.immigrationpolicy

19- Joanna Bourke, Rape: a history from 1860 to present Virago Press Ltd, London, 2007

20- http://www.guardian.co.uk/society/2007/jul/03/crime.penal

21- http://www.now.org/news/blogs/index.php/sayit/2010/02/11/working-conditions-for-women-in-u-s-lag-behind-europe

22- http://now.org/press/04-11/04-12.html

23- http://www.ohchr.org/en/NewsEvents/Pages/DisplayNews.aspx?NewsID=11479&LangID=E

24- http://www2.ohchr.org/english/bodies/hrcouncil/docs/17session/A.HRC.17.26.Add.5_AEV.pdf

25- http://nowfoundation.org/issues/violence/Oct2011SRVAWwebinar.html

26- http://edition.cnn.com/2008/US/07/31/military.sexabuse/index.html?eref=rss_topstoris

27- http://extras.denverpost.com/justice/tdp_betrayal.pdf

28- http://www.dailymail.co.uk/news/article-123003/Sick-Superwoman.html

29- http://www.commondreams.org/views02/0701-05.htm

30- http://www.dailymail.co.uk/news/article-123003/Sick-Superwoman.html